مقالات

سود میں نئے مباحث کا اضافہ

(مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی)

(۳)

نظام سرمایہ داری کا ردِ عمل

یہ[۱] تھے وہ اصل اسباب جن کی وجہ سے صنعتی انقلاب کے پیدا کیے ہوئے نظامِ تمدن و معیشت میں خرابیاں رونما ہوئیں۔ پچھلے صفحات میں ہم نے ان کا جو تجزیہ کیا ہے اس پر غور کرنے سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ درحقیقت ان خرابیوں کے موجب وہ فطری اصول نہیں تھے جن کو بورژوا حضرات نے جدید معیشت کی تائید میں پیش کیا تھا۔ بلکہ اُن کی اصلی موجب وہ غلطیاں تھیں جو ان صحیح اصولوں کے ساتھ انہوں نے ملا دی تھیں۔

اگر بروقت ان غلطیوں کو سمجھ لیا جاتا اور اہل مغرب کو وہ حکیمانہ رہنمائی مل جاتی جس سے وہ اس نئے انقلابی دور میں ایک متوازن اور معتدل معیشت کی تعمیر کر لیتے تو اُن کے لیے بھی اور ساری دنیا کے لیے بھی صنعتی انقلاب ایک نعمت اور برکت ہوتا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ مغربی ذہن اور کیرکٹر نے اس دور میں بھی اپنی انہی کمزوریوں کا اظہار کیا جو اس سے پہلے کے زمانوں میں اُس سے ظاہر ہو چکی تھیں، اور اسی بے اعتدالی کی ڈگر پر بعد کی تاریخ بھی آگے بڑھی جس پر وہ پہلے سے بھٹک کر جا پڑی تھی۔ پہلے جس مقام پر مالکانِ زمین اور ارباب کلیسا اور شاہی خاندان تھے اب اسی ہٹ دھرمی اور ظلم و زیادتی کی جگہ بورژوا طبقے نے سنبھال لی۔ اور پہلے حق طلبی اور شکوہ و شکایت اور غصہ و احتجاج کے جس مقام پر بورژوا حضرات کھڑے تھے، اب اُس جگہ محنت پیشہ عوام آ کھڑے ہوئے۔ پہلے جس طرح جاگیرداری نظام کے مطمئن طبقے نے اپنے بے جا امتیازات اور اپنے ناروا حقوق اور اپنی ظالمانہ قیود کی حمایت میں دین اور اخلاق اور قوانینِ فطرت کی چند صداقتوں کو غلط طریقے سے استعمال کرکے محروم طبقوں کا

۱؎ مفصل بحث کے لیے دیکھیے ترجمان القرآن جلد ۳۲ عدد ۵۔

منہ بند کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب بعینہٖ وہی حرکت سرمایہ داری نظام کے مظلوم طبقوں نے شروع کر دی۔ اور پہلے جس طرح غصے اور ضد اور جھنجلاہٹ میں آ کر بورژوا لوگوں نے جاگیرداروں اور پادریوں کی اصل غلطیوں کو سمجھنے اور ان کا ٹھیک ٹھیک تدارک کرنے کے بجائے اپنی نبرد آزمائی کا بہت سا زور اُن صداقتوں کے خلاف صرف کر دیا جن کا سہارا ان کے حریف لیا کرتے تھے، اسی طرح اب محنت پیشہ عوام اور ان کے لیڈروں نے بھی غیظ و غضب میں نظر و فکر کا توازن کھو دیا اور بورژوا تمدن کی اصل خرابیوں اور غلطیوں پر حملہ کرنے کے بجائے اُن فطری اصولوں پر حملہ بول دیا جن پر ابتدائے آفرینش سے انسانی تمدن و معیشت کی تعمیر ہوتی چلی آ رہی تھی۔ متوسط طبقوں کے لوگ تو اپنی کمزوریوں اور برائیوں کے باوجود پھر کچھ ذہین اور تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، اس لیے انہوں نے شکایت اور ضد کے جوش میں بھی تھوڑا بہت ذہنی توازن برقرار رکھا تھا۔ لیکن صدیوں کے پسے اور دبے ہوئے عوام جن کے اندر علم، ذہانت، تجربہ، ہر چیز کی کمی تھی، جب تکلیفوں سے بے قرار اور شکایات سے لبریز ہو کر بھڑ گئے تو کسی بات کو قبول کرنے سے پہلے عقل و حکمت کے ترازو میں تول کر اسے دیکھ لینے کا کوئی سوال ان کے سامنے نہ رہا۔ ان کو سب سے بڑھ کر اپیل اس مسلک نے کیا جس نے سب سے زیادہ شدت کے ساتھ ان کی نفرت اور اُن کے غصے اور ان کے انتقام کے تقاضے پورے کیے۔

یہی تقاضہ غریبوں کی جھنجلاہٹ کا فرزند ارجمند جسے "سوشلزم" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے[1]۔ جدید سرمایہ داری کو پیدا ہوئے نصف صدی سے کچھ ہی زیادہ مدت گزری تھی جب وہ تولد ہوا، اور اس کی ولادت

---

[1] سوشلزم کے اصل معنی ہیں "اجتماعیت"، اور یہ اصطلاح اُس انفرادیت (Individualism) کے مقابلہ میں بنائی گئی تھی جس پر جدید سرمایہ داری کا نظام تعمیر ہوا تھا۔ اس نام کے تحت بہت سے مختلف نظریے اور مسلک کارل مارکس سے پہلے پیش کیے جانے شروع ہو گئے تھے جن کا مشترک مقصد یہ تھا کہ کوئی ایسا نظام زندگی بنایا جائے جس میں بحیثیت مجموعی پورے اجتماع کی فلاح ہو، لیکن وہ سب کا سب بازار پڑ گئے۔ مارکس نے آ کر اس طلبِ عام کا جواب ایک ... ہے کے سوشلزم کی شکل میں دیا جسے سائنٹفک سوشلزم، مارکسزم اور کمیونزم وغیرہ مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہاں ہم اسی سے بحث کر رہے ہیں کیونکہ زمین میں جڑ اسی نے پکڑی۔ اصطلاحات کے معاملہ میں علمی نزاکتوں کو قصداً نظر انداز کر کے ہم وہ اصطلاحیں استعمال کر رہے ہیں جن سے ہمارے عام اردو خوان لوگ یا تو پہلے ہی مانوس ہیں، یا جنہیں اردو زبان بآسانی قبول کر سکتی ہے۔

پر نصف صدی سے کچھ بہت زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ اس کے ہنگاموں سے دنیا لبریز ہو گئی۔

سوشلزم اور اس کے اصول اس نئے مسلک کے مصنفوں نے اپنے حملے کی ابتدا "حقوقِ ملکیت" سے کی۔ انہوں نے کہا کہ اصل خرابی کی جڑ یہی بلا ہے۔ پہننے کے کپڑے، استعمال کے برتن، گھر کا فرنیچر اور اس طرح کی دوسری چیزیں تو ضرور انفرادی ملکیت میں رہنی چاہئیں، مگر یہ زمین اور مشین، اور آلات اور دوسری ایسی چیزیں جن سے دولت کی پیداوار ہوتی ہے، ان پر افراد کے مالکانہ حقوق ہرگز قائم نہ رہنے چاہئیں۔ اس لئے کہ جب ایک شخص ان میں سے کسی چیز کا مالک ہوگا تو دولت پیدا کرے گا۔ دولت پیدا کرے گا تو جمع کرے گا۔ جمع کرے گا تو پھر کچھ اور زمین یا مشین خرید کر پیدائش دولت کے ذرائع میں اضافہ کرلے گا۔ اضافہ کرے گا تو دوسرے آدمیوں سے تنخواہ، یا مزدوری، یا لگان کا معاملہ طے کرکے ان سے کام لے گا۔ اور جب یہ کرے گا تو لامحالہ پھر وہ سب کچھ کرے گا جو آج کل سرمایہ دار کر رہا ہے۔ لہٰذا سرے سے اس جڑ ہی کو کاٹ دو جس سے یہ بلا پیدا ہوتی ہے۔ پروانے کی جان بچانی ہے تو شمع کو داغ میں جانے ہی نہ دو!

سوال پیدا ہوا کہ اشیاء استعمال کے حقوقِ ملکیت کی طرح ذرائع پیداوار کے حقوق ملکیت بھی کوئی آج کی نئی چیز تو نہیں ہیں جنہیں بورژوا سرمایہ داروں نے تصنیف کرلیا ہو۔ یہ تو وہ بنیادیں ہیں جن پر قدیم ترین زمانے سے انسانی معیشت و تمدن کی عمارت تعمیر ہوتی چلی آرہی ہے۔ ایسی چیز کے اکھاڑ پھینکنے کا فیصلہ آخر یوں سرسری طور پر کیسے کر ڈالا جائے؟ جواب میں فی البدیہہ ایک پوری تاریخ گھڑ دی گئی کہ انسانیت کے آغاز میں ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت کے حقوق تھے ہی نہیں۔ یہ تو بعد میں طاقتور طبقوں نے اپنی خود غرضی سے قائم کر لئے۔

کہا گیا، ان حقوق کو تو سارے مذاہب، تمام اخلاقی نظام، دنیا بھر کے قوانین ہمیشہ سے مانتے رہے ہیں۔ اُن میں سے کسی نے بھی یہ نظریہ اختیار نہیں کیا کہ معیشت و تمدن کی وہ صورت بجائے خود غلط ہے جو ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیت سے بنتی ہے ——— جواب میں ایک لمحہ کے تامل کے بغیر دعوےٰ کر دیا گیا کہ مذہب، اخلاق اور قانون تو ہر زمانے کے غالب طبقوں کے آلۂ کار رہے ہیں۔ پیدائشِ دولت کے ذرائع پر جن طبقات کا اجارہ قائم ہو گیا انہیں اپنے اس اجارے کو محفوظ اور مضبوط کرنے کے لئے کچھ نظریات، کچھ اصولوں اور کچھ رسموں اور ضابطوں کی حاجت لاحق ہوئی، اور جن لوگوں نے یہ چیزیں ان کی اغراض کے مطابق بنا کر پیش کر دیں وہ پیغمبر اور رِشی

اور نیتیں اخلاق اور شارع و مقنن قرار دے دئے گئے۔ محنت پیشہ طبقے بہت مدت تک اس طلسم فریب کے شکار رہے۔ اب وہ اسے توڑ کر رہیں گے!

اعتراض ہوا کہ ان حقوق کو ملنے اور ختم کرنے کے لئے تو ایک ایسی سخت نزاع برپا کرنی پڑے گی جس میں ہر قوم کے مختلف عناصر آپس ہی میں گتھ جائیں گے اور قریہ قریہ اور بستی بستی میں طبقاتی جنگ کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ جواب میں کچھ دیر نہ لگی تھی کہ ایک پورا فلسفہ تاریخ گھڑ کر رکھ دیا گیا جس میں ثابت کیا گیا کہ انسانی تمدن کا تو سارا ارتقا ہی طبقاتی جنگ کے ذریعہ سے ہوا ہے۔ اس راستہ کے سوا ارتقاء کا اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔

پھر اعتراض ہوا کہ اپنے ذاتی نفع کے لئے کام کرنا تو انسان کی فطرت اور جبلت میں پیوست ہے اور ہر انسان ماں کے پیٹ سے یہی میلان لئے ہوئے پیدا ہوتا ہے۔ تم جب افراد سے ذرائع پیداوار کی ملکیت چھین لوگے اور ان کے لئے یہ موقع باقی ہی نہ رہنے دوگے کہ وہ جتنی کوشش کریں اتنا نفع حاصل کرتے چلے جائیں، تو ان کے اندر کوشش کرنے کا جذبہ ہی نہ پیدا ہوگا اور یہ چیز بالآخر انسانی تہذیب و تمدن کے لئے برباد کن ثابت ہوگی۔ ——— اس پر چھوٹتے ہی برملا جواب دیا گیا فطرت؟ جبلت؟ موروثی میلانات؟ یہ کیا بوڑھوں کی باتیں کرتے ہو۔ انسان کے اندر ان ناموں کی کوئی چیز سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اس کے تو سارے رجحانات صرف اجتماعی ماحول کی پیداوار ہیں۔ ایک ماحول کو بدل کر دوسرا ماحول پیدا کر دو، اس کا دماغ دوسری طرح سوچنے لگے گا، اس کا دل دوسری قسم کے جذبات کی آماجگاہ بن جائے گا، اس کے نفس سے کچھ اور ہی میلانات کی تراوش شروع ہو جائے گی۔ جب تک انفرادی ملکیت کا نظام قائم ہے، لوگ "انفرادی الذہن" ہیں۔ جب اجتماعی ملکیت کا نظام قائم ہو جائے گا یہی سب لوگ "اجتماعی الذہن" ہو جائیں گے۔

پوچھا گیا، انفرادی ملکیت ختم کر کے آخر سارا معاشی کاروبار چلایا کیسے جائے گا؟ ——— جواب ملا تمام ذرائع پیداوار (زمین، کارخانے، اور ہر قسم کے تجارتی و صنعتی ادارے) افراد کے قبضے سے نکال کر قومی ملکیت بنا دیئے جائیں گے، جو لوگ ان اداروں میں کام کریں گے انہی میں ان کے منافع تقسیم ہو جائیں گے، اور ان کارکنوں کے ووٹوں سے ہی وہ منتظمین منتخب ہوا کریں گے جن کے ہاتھ میں اس ساری معیشت کا انتظام ہوگا۔

سوال اٹھا، جو لوگ اس وقت زمینوں اور کارخانوں اور دوسرے ذرائع پیداوار کے مالک ہیں ان کی ملکیت

ختم کرنے اور اجتماعی ملکیت قائم کرنے کی صورت کیا ہوگی؟ ــــ اس سوال کے دو مختلف جواب دیئے گئے،

ایک مسلک والوں نے جواب دیا اس تغیر کے لئے جمہوری طریقے اختیار کیئے جائیں گے، رائے عام کو ہموار کر کے سیاسی اقتدار پر قبضہ کیا جائے گا، اور قانون سازی کے ذریعہ سے بتدریج زرعی جائدادوں، صنعتوں اور تجارتوں کو بعض حالات میں بلا معاوضہ اور بعض حالات میں معاوضہ ادا کر کے، اجتماعی ملکیت بنا لیا جائیگا۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے اب بالعموم "سوشلسٹ" کا لفظ مخصوص ہوگیا ہے۔ اور کبھی کبھی ان کے مسلک کو ارتقائی سوشلزم بھی کہتے ہیں۔

دوسرے مسلک والوں نے کہا جمہوری طریقوں سے یہ تغیر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے تو انقلابی طریق کار ناگزیر ہے۔ نادار و محنت پیشہ عوام کو منظم کیا جائے گا۔ ملکیت رکھنے والے طبقوں کے خلاف ہر ممکن ذریعہ سے جنگ کی جائیگی۔ بورژوا حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے گا۔ مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ قائم کی جائیگی۔ مالکان زمین سے ان کی زمینیں اور کارخانہ داروں سے ان کے کارخانے اور تاجروں سے ان کی تجارتیں زبردستی چھین لی جائیگی۔ جو مزاحمت کرے گا اسے فنا کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ سارے طبقات کو ختم کر کے تمام آبادی کو ایک طبقہ (یعنی اپنے ہاتھ سے کام کر کے روٹی کمانے والا طبقہ) بنا دیا جائے گا۔ اور ازروئے قانون یہ چیز حرام کر دی جائیگی کہ ایک شخص دوسرے شخص یا اشخاص سے اجرت پر کام لے اور اس کام کا نفع کھائے۔ پھر جب یہ انقلاب مکمل ہو جائے گا اور سرمایہ دار طبقات کے از سر نو جی اٹھنے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے گا تو یہ ڈکٹیٹر شپ آپ سے آپ (خدا جانے کس طرح) سوکھ کر جھڑ جائے گی اور خود بخود (نہ معلوم کیسے) ایک ایسا نظم اس کی جگہ لے لے گا جس میں حکومت اور جبر کے بغیر زندگی کے سارے شعبے لوگوں کی باہمی رضامندی، مشاورت اور تعاون سے چلتے رہیں گے۔ اس دوسرے مسلک کا نام انقلابی سوشلزم ہے۔ اسی کو بولشوزم کے نام سے بھی یاد کیا جاتا رہا ہے۔ اسی کو مارکسزم بھی کہتے ہیں مگر اب دنیا اسکو زیادہ تر کمیونزم کے مشہور و معروف نام سے جانتی ہے۔

ستر اسی سال تک سوشلزم کا یہ نیا مسلک اپنی بے شمار شاخوں اور اپنے مختلف الاقسام مذاہب فکر کے ساتھ یورپ اور اس کے زیر اثر ملکوں میں پھیلتا رہا۔ ابتداءً یہ چند سر پھروں کی ایک نرالی اپج تھی جس کے

مقدمات اور دلائل اور نتائج، سب قطعی اور مدلّل تھے اور صرف غضبناک مزدوروں ہی میں اسکو علم و عقل کی بنا پر نہیں بلکہ بھڑکے ہوئے جذبات کی بنا پر مقبولیت حاصل ہو رہی تھی لیکن مغربی ذہن کی دلچسپ کمزوریوں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اُپج کو بہت پسند کرتا ہے خصوصًا جب کہ وہ نہایت لغو ہو اور اس کا پیش کرنے والا بے دھڑک اور بے جھجک ہو کر بڑے سے بڑے مسلمات کو کاٹتا چلا جائے اور اپنے دعاوی کو ذرا سا منطقی طریقہ سے اتنا مرتب کرے کہ ان کے اندر ایک "سسٹم" پیدا ہو جائے[1]۔ یہ خصوصیات اِس "سائنٹفک سوشلزم" میں بدرجۂ تمام پائی جاتی تھیں۔ اسی وجہ سے نچلے متوسط طبقے کے بہت سے ذہین لوگ اور خود بورژوا طبقہ میں سے بعض سنکی اور بعض ہوشیار لوگ اس مسلک کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اسکی شرح و تفسیر اور دعوت و تبلیغ میں کتابوں، رسالوں اور اخباروں کے ڈھیر لگنے شروع ہو گئے، دنیا بھر کے ملکوں میں مختلف سوشلسٹ نظریات کی حامی پارٹیاں منظم ہو گئیں، اور آخر کار انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد سنجیدگی کے ساتھ یہ سمجھنے لگی کہ ان نظریات پر ایک نظامِ تمدن و معیشت تعمیر ہو سکتا ہے۔

کمیونزم اور اس کا میزانیۂ نفع و نقصان جہاں تک ارتقائی سوشلزم کا تعلق ہے اس نے تو ابھی دنیا میں اپنا کوئی نمونہ پیش نہیں کیا ہے جس کو دیکھ کر ہم پورے طور پر معلوم کر سکیں کہ اس کا طریق کار کس طرح انفرادی سرمایہ داری کے نظام کو اجتماعیت میں تبدیل کرے گا اور اس سے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ اس لیے ہم اسکو چھوڑ کر یہاں انقلابی اشتراکیت یعنی کمیونزم کے کارنامے کا جائزہ لیں گے جس نے ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم اوّل سے فائدہ اٹھا کر روس میں فی الواقع ایک انقلاب برپا کر دیا اور اپنے نظریات کے مطابق ایک پورا نظامِ تمدن قائم کر ڈالا[2]۔

[1] یہ بات کسی جغرافی تعصب کی بنا پر نہیں کہی جا رہی ہے۔ مشرق میں جو مغرب زدہ ذہن پیدا ہوا ہے اس کا حال اس سے بھی زیادہ بدتر ہے۔ مغربی ذہن پھر غنیمت ہے کہ کچھ اپج کی بات دیکھ کر اس پر ریجھتا ہے اور ایک سسٹم اور سائنٹفک طرز کو تو پسند کرتا ہے۔ مگر یہاں وہ غلام ذہن جنم لے رہا ہے جس کو مرعوب و متاثر کرنے والی اصل چیز صرف یہ ہوتی ہے کہ بات مغرب کے کسی امام کی کہی ہوئی ہے۔

[2] واضح رہے کہ سوشلزم اور کمیونزم میں فرق صرف طریقِ کار کا ہے۔ رہا اصول کہ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنا دیا جائے، تو وہ دونوں میں مشترک ہے۔ اس لیے طریقہ کی بحث کو الگ کر کے ذرائع پیداوار کو قومی بنانے کے فوائد اور نقصانات پر جو کچھ بھی گفتگو کی جائیگی وہ ان دونوں مسلکوں پر چسپاں ہوگی:

روسی اشتراکیت چونکہ پچھلے کئی سال سے سخت مباحثوں اور مناظروں کا موضوع بنی رہی ہے، اس لئے اسکی میزانِ نفع و نقصان بنانے میں اس کے حامیوں اور مخالفوں، دونوں کی طرف سے بڑی کھینچ تان ہوتی رہتی ہے۔ اس کے حامی اُس کے نفع کے پہلو میں بہت سی ایسی چیزوں کو داخل کر دیتے ہیں جو درا صل اشتراکیت کے منافع نہیں ہیں بلکہ قابل اور مستعد لوگوں کے ہاتھ میں انتظام ہونے کے ثمرات ہیں۔ دوسری طرف اس کے مخالف اس کے نقصان کے پہلو میں بہت سی اُن خرابیوں کو رکھ دیتے ہیں جو بجائے خود اشتراکیت کے نقصانات نہیں بلکہ ظالم اور تنگ ظرف افراد کے برسر اقتدار آجانے کے نتائج ہیں۔ اشتراکی روس کے حامیوں کا یہ طریقہ کہ وہ عہد زار کے روس کی خستہ حالی، جہالت اور پس ماندگی سے موجودہ روس کی علمی، ذہنی، صنعتی اور تمدنی حالت کا مقابلہ کرتے ہیں، اور حاصلِ جمع و تفریق میں جتنی ترقی نکلتی ہے اس سب کو اشتراکیت کی برکات کے خانے میں درج کر دیتے ہیں، اصولاً کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ تیس بتیس سال کی مدت میں جتنی کچھ بھی ترقی روس نے کی ہے اس کا مقابلہ اگر امریکہ، جاپان، یا جرمنی کے ایسے ہی تیس بتیس سال سے کیا جائے تو شاید تناسب کچھ زیادہ ہی نکلے گا۔ مثلاً ۱۸۶۰ء میں جاپان تعلیم اور صنعت و حرفت اور قدرتی وسائل کے استعمال اور پیداوار دولت کے لحاظ سے کیا کچھ تھا اور ۱۹۰۴ء میں جب اس نے روس کو شکست دی تو وہ اِن حیثیات سے کس مرتبے پر پہنچ گیا تھا۔ یا ۱۸۷۰ء میں جرمنی کی حالت کیا تھی اور بیسویں صدی کے آغاز تک پہنچتے پہنچتے اس کے باشندے علمی و ذہنی حیثیت سے اور اس کے معاشی وسائل اپنی پیداوار کے لحاظ سے کہاں جا پہنچے تھے۔ اگر ان ترقیات کا اتنی ہی مدت کی روسی ترقیات سے موازنہ کر کے دیکھا جائے تو روس کے حساب میں آخر کتنا سرمایۂ افتخار نکلے گا؟ پھر کیا یہ اصول مان لیا جائے کہ ایک ملک نے ایک خاص زمانہ میں اگر کچھ غیر معمولی ترقی کی ہو تو اسکی ساری تعریف اُن اصولوں کے حق میں لکھ دی جائے جن پر اس ملک کا نظام تمدن و معیشت و سیاست قائم ہو؟ حالانکہ بسا اوقات اجتماعی زندگی کا سارا کارخانہ غلط اصولوں پر چل رہا ہوتا ہے مگر رہنماؤں کی انفرادی خوبیاں اور ان کے مددگاروں کی عمدہ صلاحیتیں بڑے شاندار نتائج پیدا کر دکھاتی ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس اشتراکی روس کی جن خرابیوں کا حوالہ اس کے مخالفین دیتے ہیں اُن میں بھی بہت سی خرابیاں وہ ہیں جو کم و بیش اس طریقہ پر غیر اشتراکی جباروں کی فرمانروائی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم

ان سب کو برے افراد کے حساب میں سے نکال کر اُس اصول کے حساب میں ڈال دیں جس پر اُن کا نظام تمدن و معیشت قائم ہوا ہے؟

فوائد جو متعلق چیزوں کو الگ کر کے جب ہم اصل اشتراکیت کے اس کارنامے پر نگاہ ڈالتے ہیں جو روسی تجربہ کی بدولت ہمارے سامنے آیا ہے، تو نفع کے خانے میں ہم کو یہ چیزیں ملتی ہیں۔

(۱) افراد کے قبضہ سے زمین، کارخانے اور تمام کاروبار نکال لینے کا یہ فائدہ ہوا کہ اشیاء کی لاگت اور ان کی بازاری قیمت کے درمیان جو منافع پہلے زمیندار، کارخانہ دار اور تاجر لیتے تھے وہ اب حکومت کے خزانے میں آنے لگا اور یہ ممکن ہوگیا کہ اس منافع کو اجتماعی فلاح کے کاموں پر صرف کیا جاسکے۔

(۲) تمام ملک کے ذرائع پیداوار ایک ہی نظم و نسق کے قبضہ میں آجانے سے یہ ممکن ہوگیا کہ ایک طرف ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے مطابق ان سب کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے اور زیادہ سے زیادہ مفید طریقے سے استعمال کرنے کی کوشش کی جائے اور دوسری طرف سارے ملک کی ضروریات کو سامنے رکھ کر انہیں پورا کرنے کی منظم تدابیر عمل میں لائی جائیں۔

(۳) سارے وسائل دولت پر قابض ہو کر جب حکومت ایک جامع منصوبہ بندی کے مطابق ان کو چلانے لگی تو اس کے لئے یہ بھی ممکن ہوگیا کہ ملک کے تمام قابلِ کار آدمیوں کو کام پر لگائے اور یہ بھی کہ وہ ان کو ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق تعلیم و تربیت دے کر اس طرح تیار کرے کہ اجتماعی معیشت کے لئے جن پیشوں اور خدمات کے لئے جتنے آدمی درکار ہیں اتنے ہی وہ تیار کئے جاتے رہیں۔

(۴) اور پر نمبر ایک میں زراعت، صنعت اور تجارت کے جس منافع کا ذکر کیا گیا ہے وہ جب حکومت کے ہاتھ میں آگیا تو وہ اس قابل ہوگئی کہ اس منافع کا ایک حصہ "سوشل انشورنس" کے انتظام پر صرف کرے۔ سوشل انشورنس کا مطلب یہ ہے کہ تمام ملک میں جو لوگ کام کرنے کے قابل نہ ہوں، یا عارضی یا مستقل طور پر ناقابلِ کار ہو جائیں، یا بیماری، زچگی اور دوسرے مختلف حالات کی وجہ سے جن کو مدد کی ضرورت پیش آئے ان کو ایک مشترک خزانے سے مدد دی جائے۔

نقصانات کوئی شک نہیں کہ بے قید معیشت سے جو بیماریاں پیدا ہوئی تھیں، اس آپریشن نے ان کا خوب ہی

کامیاب علاج کیا۔ مگر روس کو اسکی قیمت کیا دینی پڑی؟ اور پچھلی بیماریوں کو دور کرنے کے لئے دوسری کیا بیماریاں اس نے مول لیں؟ آیئے اب ذرا اس کا جائزہ بھی لے لیں۔

(۱) افراد کے قبضہ سے زمینوں، کارخانوں اور تمام دوسرے ذرائع پیداوار کو نکالنا اور ان ساری چیزوں کو اجتماعی ملک بنا دینا بہرحال کوئی کھیل نہ تھا کہ بس ہنسی خوشی انجام پاگیا ہو۔ یہ ایک بڑا ہی سخت کام تھا جو برسوں تک مسلسل نہایت ہولناک ظلم وستم کرنے سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ ہر شخص خود ہی قیاس کرسکتا ہے کہ آپ لاکھوں آدمیوں کو ان کی چھوٹی بڑی املاک سے زبردستی بے دخل کرنے پر تل جائیں تو وہ بآسانی آپ کے اس فیصلہ کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کردیں گے۔ یہ کام جب اور جہاں بھی ہوگا سخت کشت وخون ہی سے ہوگا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس اسکیم کو عمل میں لانے کے لئے تقریباً ۱۰ لاکھ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا، ۲۰ لاکھ آدمیوں کو مختلف قسم کی سخت سزائیں دی گئیں۔ اور چالیس پچاس لاکھ آدمیوں کو ملک چھوڑ کر دنیا بھر میں تتر بتر ہو جانا پڑا۔ صرف ایک اجتماعی زراعت کی اسکیم نافذ کرنے کے لئے لاکھوں چھوٹے چھوٹے اور متوسط زمینداروں (Kulaks) کو جس بے دریغ طریقہ سے فنا کیا گیا اس پر تو خود روس کے پرجوش حامی بھی چیخ اٹھے۔

(۲) جو لوگ تمام دنیا کے مسلّم مذہبی، اخلاقی اور قانونی اصولوں کے مطابق اپنی املاک کے جائز مالک ہوں انہیں اگر آپ اپنی ایک خود ساختہ اور نرالی اسکیم نافذ کرنے کے لئے زبردستی ان کی ملکیتوں سے بے دخل کرنا چاہیں گے تو لامحالہ آپ کو نہ صرف اُن تمام مذہبوں اور اخلاقی اصولوں کا جو آپ کے نظریے کے خلاف ہیں، انکار کرنا پڑے گا، بلکہ ملکیتوں کے ساتھ ساتھ ان کی بھی بیخ کنی پر اپنی ساری قوت لگا دینی ہوگی۔ مزید برآں اپنی اس اسکیم کو ہر قسم کی بے دردی اشقاوت، ظلم، جھوٹ اور فریب سے نافذ کرنے کے لئے آپ مجبور ہوں گے کہ سرے سے ایک نیا ہی نظریۂ اخلاق وضع کریں جس کے تحت ہر ظلم وجبر اور ہر بے دردی وسنگ دلی کا ارتکاب جائز ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی لیڈروں اور کارکنوں نے اپنے پیش نظر انقلاب کو عمل میں لانے کے لئے خدا اور مذہب کے خلاف سخت پراپیگنڈا کیا، اور بورژوا طبقہ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مذہبی طبقوں کو بھی بڑی سختی سے کچلا، اور اخلاق کا ایک نیا نظریہ پیدا کیا جو لینن کے الفاظ میں یہ ہے:-

"ہم ہر اُس اخلاق کو رد کرتے ہیں جو عالم بالا کے کسی تصور پر مبنی ہو یا ایسے خیالات سے ماخوذ

ہو جو طبقاتی تصورات سے ماوراء ہیں۔ ہمارے نزدیک اخلاق قطعی اور کلی طور پر طبقاتی جنگ کا تابع ہے۔ ہر وہ چیز اخلاقاً بالکل جائز ہے جو پرانے نفع اندوز اجتماعی نظام کو مٹانے کیلئے اور محنت پیشہ طبقوں کو متحد کرنے کے لئے ضروری ہو۔ ہمارا اخلاق بس یہ ہے کہ ہم خوب منضبط اور منظم ہوں اور نفع گیر طبقوں کے خلاف پورے شعور کے ساتھ جنگ کریں۔ ہم یہ ماننے ہی نہیں کہ اخلاق کے کچھ ازلی وابدی اصول بھی ہیں۔ ہم اس فریب کا پردہ چاک کر کے رہیں گے۔ اشتراکی اخلاق اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مزدوروں کی مطلق العنان حکومت کو مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کے لئے جنگ کی جائے۔"

یہ دوسری بھاری قیمت تھی جو سرزمین روس کو اشتراکی نظام کے لئے دینی پڑی۔ یعنی صرف ایک کروڑ آدمیوں کی زندگی ہی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ دین، ایمان، اخلاق، انسانیت، شرافت، اور وہ سب کچھ جو ایک انوکھی اسکیم کو جبر وظلم سے نافذ کرنے میں مانع تھا۔

(۳) ہم خود اپنے ملک میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں کہ جب ایک طرف عام اخلاقیات کے بند ڈھیلے ہوتے ہیں، اور دوسری طرف مختلف ضروریاتِ زندگی پر سرکاری کنٹرول نافذ کر دیا جاتا ہے تو رشوت، خیانت اور غبن کا سلسلہ بے تحاشا چل پڑتا ہے اور زندگی کی جو ضرورت بھی پرمٹ، لائسنس، راشن کارڈ یا کوٹا ملنے پر موقوف ہو جاتی ہے اسی کے معاملے میں پبلک کو ہر طرح تنگ ہونا پڑتا ہے اور سرکاری آدمیوں کے وارے نیارے ہونے لگتے ہیں۔ اب خود اندازہ کر لیجئے کہ جہاں ایک طرف سارے ہی اخلاقی ضوابط کی جڑیں ہلا ڈالی گئی ہوں، اور اخلاق کا یہ اصول لوگوں کے ذہن نشین کر دیا گیا ہو کہ جو کچھ مفید مطلب ہے وہی حق اور صدق ہے، اور ملک کے رہنماؤں نے خود بدترین قسم کے ظلم وستم کر کے اس نئے اخلاق کے شاندار نمونے دکھا دیئے ہوں، اور جہاں دوسری طرف ضرورت کی صرف چند چیزیں نہیں بلکہ ملک کی پوری ہی معاشی دولت اور سارے ہی وسائلِ زندگی سرکاری کنٹرول میں ہوں، وہاں رشوت، خیانت، غبن اور عام مردم آزاری کی کیسی کچھ گرم بازاری ہوگی۔ یہ معاملہ صرف قیاس کی حد تک نہیں ہے۔ روس کے "آہنی پردے" سے چھن چھن کر جو خبریں وقتاً فوقتاً باہر آجاتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہاں عمالِ حکومت اور مختلف معاشی اداروں کے ارباب انتظام نے

"بدکرداری" (Corruption) کا ایک اچھا خاصا سخت مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ درحقیقت وہاں اس مسئلے کا پیدا ہونا قابلِ تعجب نہیں ہے بلکہ نہ ہونا تعجب کے قابل ہوتا۔ ایک نظام کو تم بداخلاقی کے زور سے توڑ بھی سکتے ہو، اور دوسرا نظام بداخلاقی کے زور سے قائم بھی کر سکتے ہو، لیکن کسی نئے نظام کو بداخلاقی کے بل بوتے پر چلائے جانا سخت مشکل ہے۔ اسے ٹھیک ٹھیک چلانے کے لئے بہر حال عمدہ اور مضبوط سیرت کے آدمیوں کی ضرورت ہے اور اس کا سانچہ تم خود پہلے ہی توڑ چکے ہو۔

(۴) انفرادی ملکیتوں کو ختم کر کے اجتماعی ملکیت کے اصول پر ملک کے معاشی نظام کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے سب سے بڑھ کر جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں کے اندر سے خود غرضی اور ذاتی نفع کی طلب نکال دی جائے اور ان صفات کے بجائے ان کے ذہن پر مجموعی بھلائی کے لئے کام کرنے کا جذبہ اتنا غالب کر دیا جائے کہ وہی ان کے اندر اصل محرکِ عمل بن جائے۔ اشتراکیوں کا دعویٰ یہ تھا کہ انسانی فطرت اور جبلت اور موروثی میلانات محض بورژوا فلسفہ و سائنس کے ڈھکوسلے ہیں۔ اس نام کی کوئی چیز انسان کے اندر موجود نہیں ہے۔ ہم ذاتی نفع طلبی اور خود غرضی کے میلانات لوگوں میں سے نکال ڈالیں گے اور ماحول کے تغیر سے اجتماعی ذہنیت ان میں پیدا کریں گے۔ لیکن اس بے بنیاد دعوے کو عملی جامہ پہنانے میں اشتراکی حضرات قطعی ناکام ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے ملک کے عوام اور اپنے نظامِ معیشت و تمدن کے کارفرماؤں اور کارکنوں میں حقیقی اجتماعی ذہنیت اس مقدار سے ایک ماشہ بھر بھی زیادہ نہیں بڑھا سکے جتنی ہر سوسائٹی کے لوگوں میں فطرۃً موجود رہتی ہے۔ وہ ان کے اندر سے خود غرضی و نفع طلبی کو نکال دینا تو درکنار، اسے کم بھی نہ کر سکے، بلکہ انہیں تھک ہار کر آخر کار اسے سیدھی طرح تسلیم کرنا پڑا اور لوگوں سے کام لینے کے لئے ان کی خود غرضی ہی کو اپیل کرنا پڑا۔ اس حد تک تو خیر وہ بورژوا نظامِ زندگی کے برابر رہے۔ مگر جس چیز نے ان کو بورژوا نظام سے بھی زیادہ خرابی میں مبتلا کیا وہ یہ ہے کہ جب انہوں نے افراد کی نفع طلبی کے لئے زراعت، صنعت، تجارت اور دوسرے فائدہ مند کاروبار کے فطری راستے بند کر دیئے، اور مصنوعی پروپیگنڈا کے ذریعہ سے اس نفع طلبی کے صاف اور سیدھے اور معقول مظاہر کو خواہ مخواہ معیوب ٹھہرا دیا، تو یہ جذبہ اندر دب گیا، اور اب ان کے تمام دوسرے دبے ہوئے جذبات کی طرح اس نے بھی منحرف (Pervert) ہو کر اپنے ظہور کے لئے ایسی غلط راہیں نکال لیں جو سوسائٹی کی جڑیں اندر ہی اندر کھوکھلی کر رہی ہیں۔ اشتراکی معاشرے

میں رشوت، خیانت، چوری، غبن، اور اسی طرح کی دوسری برائیوں کے بڑھنے میں اس چیز کا بھی بڑا دخل ہے۔ وہاں اگر کوئی چیز ممنوع ہے تو صرف یہ کہ ایک آدمی اپنی کمائی ہوئی دولت کو مزید دولت پیدا کرنے والے کسی کاروبار میں لگائے۔ اس کے سوا دولت کے سارے مصرف اسی طرح کھلے ہوئے ہیں جس طرح ہماری سوسائٹی میں ہیں۔ ایک آدمی اپنے لباس، خوراک، مکان، سواری، فرنیچر اور سامان عیش وعشرت پر جتنا چاہے روپیہ خرچ کر سکتا ہے، اپنا معیار زندگی جتنا چاہے بلند کر سکتا ہے، عیاشی وخوش باشی کی وہ ساری ہی صورتیں دل کھول کر اختیار کر سکتا ہے جو مغربی سوسائٹی میں مباح ہیں، اس سے جو روپیہ بچے اُسے جمع کر سکتا ہے، اس جمع کردہ دولت کو براہ راست خود تو نہیں مگر حکومت کے ذریعہ سے کاروبار میں بھی لگا سکتا ہے اور اس پر آٹھ دس فیصدی سالانہ تک سود پا سکتا ہے، اور جب مرنے لگے تو اس جمع شدہ دولت کو اپنے وارثوں کے لئے چھوڑ جا سکتا ہے۔

(۵) اس قدر کشت وخون اور کھیڑ پچھاڑ اور اتنے بڑے پیمانے پر دین واخلاق وانسانیت کی بربادی جس غرض کے لئے برداشت کی گئی تھی وہ یہ تھی کہ اشیاء کی لاگت اور ان کی بازاری قیمت کے درمیان جو منافع صرف زمیندار اور کارخانہ دار اور تاجر طبقے کھا جاتے ہیں۔ وہ چند مخصوص طبقوں کی جیب میں جانے کے بجائے پوری سوسائٹی کے خزانے میں آئے اور سب پر برابری کے ساتھ یا کم از کم انصاف کے ساتھ تقسیم ہو۔ یہی انفرادی ملکیتوں کو ختم کرنے کی اصل غرض تھی اور یہی، اگر حاصل ہوتی تو اسے اجتماعی ملکیت کا اصلی فائدہ کہا جا سکتا تھا۔ مگر کیا واقعی یہ مقصد پورا ہوا؟ ذرا تجزیہ کر کے دیکھئے کہ انفرادی ملکیتوں کو ختم کرنے سے زراعت، صنعت اور تجارت کے جو منافع اجتماعی خزانے میں آ رہے ہیں وہ تقسیم کس طرح ہوتے ہیں:-

الف۔ حکومت کے تمام شعبوں اور معاشی کاروبار کے تمام اداروں میں ادنیٰ ملازمین اور اعلیٰ عہدہ داروں کے درمیان معاوضوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کسی بورژوا سوسائٹی کے اندر پایا جاتا ہے۔ ایک طرف ایک عام کارکن کی تنخواہ اور اس کی زندگی کا معیار امریکہ وانگلستان کے مزدوروں کی بہ نسبت بہت پست ہے اور ہندستان و پاکستان کے معیار سے اگر کچھ اونچا ہے تو کچھ بہت زیادہ نہیں۔ دوسری طرف ڈائرکٹروں اور منیجروں اور حکومت کے عہدہ داروں اور فوجی افسروں اور ایکٹروں اور ایکٹرسوں اور مصنفین ومولفین وغیرہ کی آمدنیاں بڑھتے بڑھتے کئی کئی لاکھ روبل سالانہ تک پہنچ گئی ہیں۔ گویا اگر پوری طرح نہیں تو ایک بڑی حد تک یہ تجارتی وصنعتی منافع اونچے اونچے

طبقوں کے درمیان اسی نامساوی طریقہ سے تقسیم ہو رہا ہے جس طرح پہلے محنت پیشہ مزدوروں اور بورژوا لوگوں کے درمیان ہوتا تھا۔

ب۔ پھر اشتراکی انقلاب برپا کرنے کے لئے محنت پیشہ عوام اور بورژوا لوگوں کے درمیان نفرت اور بغض اور انتقام کی جو عالمگیر آگ بھڑکائی گئی اس نے تمام دنیا کے غیر اشتراکی معاشروں کو روس کا مخالف بنا دیا اور اس بنا پر روس مجبور ہو گیا کہ انفرادی ملکیتوں کو ختم کر کے جو تجارتی و صنعتی منافع اس نے بورژوا طبقے کے ہاتھوں میں جانے سے بچایا تھا اس کا ایک بہت بڑا حصہ جنگی تیاریوں پر صرف کر دے۔

ج۔ ان دو بڑی بڑی مدوں میں کھپ جانے کے بعد اس منافع کا جتنا حصہ محنت پیشہ عوام کے نصیب میں آیا ہے وہ بس وہی ہے جو "سوشل انشورنس" کے کام میں صرف ہوتا ہے۔ اور کل منافع کے مقابلہ میں اس کا تناسب کیا ہے؟ انتہائی مبالغہ کے ساتھ بمشکل ایک یا دو فی صدی۔[1]

سوال یہ ہے کہ اگر اتنا ہی کچھ بلکہ اس سے زیادہ اچھی طرح کسی اور طریقہ سے سوشل انشورنس کے لئے ملنے لگے تو پھر اس مار دھاڑ اور اس ظلم و ستم اور اس قربانی دین و اخلاق کے ساتھ انفرادی ملکیتیں ختم کرنے اور خواہ مخواہ اجتماعی ملکیت کا ایک مصنوعی نظام انسانی زندگی پر ٹھونسنے کی آخر حاجت ہی کیا ہے؟

(۲) اجتماعی ملکیت، اجتماعی نظم و نسق اور اجتماعی منصوبہ بندی کو رائج کرنے کے لئے جان و مال اور مذہب و اخلاق اور انسانیت کی جو کٹھی بربادی روس کو برداشت کرنی پڑی وہ تو گویا اس تجربے کے آغاز کی لاگت تھی مگر اب رو بعمل آجانے کے بعد روز مرہ کی زندگی میں وہ اہل روس کو دے کیا رہا ہے اور ان سے لے کیا رہا ہے اس کا بھی ذرا موازنہ کر دیکھئے۔ وہ جو کچھ انہیں دیتا ہے وہ یہ ہے کہ:۔

[1] سوشل انشورنس کا فنڈ روس میں جس طریقہ سے فراہم کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر ادارے کا نظم و نسق بحیثیت مجموعی جتنی رقم کارکنوں کے معاوضوں پر صرف کرتا ہے اس کا دس فی صدی سے لے کر ۲۰ فی صدی تک ایک حصہ ایک مخصوص قاعدے کے مطابق سوشل انشورنس اسکیم کے حساب میں جمع کر دینا ہوتا ہے۔ اس طرح اوسطاً تمام ملک کی تنخواہوں اور مزدوریوں کے مجموعہ کا جو اتنی حصہ کارکنوں کی اجتماعی بہتری پر صرف ہو رہا ہے۔ یہ مشکل ہی سے کل معاشی منافع کا ایک یا دو فی صدی حصہ بنتا ہے۔

ہر شخص کے لئے کم از کم اتنے روزگار کا انتظام ہوگیا ہے جس سے وہ دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا اور سر چھپانے کو جگہ پا سکے۔ اور

اجتماعی طور پر اس امر کا بھی انتظام ہوگیا ہے کہ برے وقت پر آدمی کو سہارا مل سکے۔

بس یہی وہ اصل فائدے ہیں جو اس نئے نظام نے باشندگانِ ملک کو دیئے۔ اب دیکھیے کہ اس نے لیا کیا:۔

انفرادی ملکیت کے بجائے اجتماعی ملکیت کا نظام قائم کرنے کے لئے ناگزیر تھا کہ یہ کام وہی پارٹی اپنے ہاتھ میں لے جو اس نظریہ کو لے کر اٹھی تھی یعنی کمیونسٹ پارٹی۔ اس پارٹی کا نظریہ خود بھی یہ تھا اور خود اس کام کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ایک زبردست ڈکٹیٹرشپ قائم ہو جو پورے زور کے ساتھ انفرادی ملکیت کے نظام کو توڑ دے اور سخت ہاتھوں سے نئے نظام کو رائج کر دے۔ چنانچہ یہ ڈکٹیٹرشپ قائم ہوگئی اور اس کو کارکنوں کی ڈکٹیٹرشپ کا نام دیا گیا۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ روس کے مزدوروں اور کاشتکاروں اور مختلف شعبہائے زندگی کے کارکنوں کی ساری آبادی کمیونسٹ پارٹی میں شامل نہیں ہے۔ شاید اس آبادی کے ۵ فی صدی لوگ بھی پارٹی کے ممبر نہ ہوں گے۔ پس ظاہر میں تو نام یہ ہے کہ یہ مزدوروں کی ڈکٹیٹرشپ ہے، مگر حقیقت میں یہ مزدوروں پر کمیونسٹ پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ ہے۔

اور یہ ڈکٹیٹرشپ بھی کچھ ہلکی پھلکی سی نہیں ہے۔ اجتماعی ملکیت کے معنی یہ ہیں کہ ملک کے تمام زمیندار ختم کر دیئے گئے اور ایک وحدہٗ لاشریک زمیندار سارے ملک کی زمین کا مالک ہوگیا۔ سارے کارخانہ دار اور تجار اور صناع بھی ختم ہوگئے، اور ان سب کی جگہ ایک ایسے سرمایہ دار نے لے لی جو ذرائع پیداوار کی ہر قسم اور ہر صورت پر تنہا قابض ہوگیا۔ اور پھر اسی کے ہاتھ میں سارے ملک کی سیاسی طاقت بھی مرکوز ہوگئی۔ یہ ہے کمیونسٹ پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ۔ اب اگر روس میں بظاہر آپ یہ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اس پوری معاشی، تمدنی اور سیاسی طاقت کو استعمال کر رہے ہیں وہ عام آبادی کے ووٹوں ہی سے منتخب ہوا کرتے ہیں تو کیا فی الواقع اس کے معنی جمہوریت کے ہیں؟ سارے روس میں کس کی ہمت ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کے مقابلے میں ووٹ مانگنے کے لئے اٹھ سکے؟ اور اگر کوئی اسکی جرأت کرے بھی تو وہ سرزمین روس میں کھائے گا کہاں سے؟ اپنی آواز اٹھائے گا کس پریس سے؟ اور اپنی بات سنانے کے لئے ملک میں سفر کن ذرائع سے کرے گا؟ بلکہ یہ سب کچھ کرنے سے پہلے اسکو زندگی اور موت کا درمیانی فاصلہ طے کرنے میں دیر کتنی لگے گی! حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی ملکیت کے نظام میں حکومت کے پاس اتنی طاقت جمع ہو جاتی ہے جو

تاریخ انسانی میں کسی بڑے سے بڑے چنگیز اور ہلاکو اور نادر اور قیصر کے پاس بھی جمع نہیں ہوئی تھی۔ جو گروہ ایک دفعہ اس طاقت پر قابض ہو جائے پھر اس کے مقابلہ میں اہل ملک بالکل بے بس ہو جاتے ہیں۔ کسی قسم کی بگڑی ہوئی حکومت کو بدل دینا اس قدر مشکل نہیں ہے جس قدر ایک بگڑی ہوئی اشتراکی حکومت کو بدلنا مشکل ہے۔

اس نظام حکومت میں برسر اقتدار پارٹی ملک کی مجموعی زندگی کے لئے جو منصوبہ بناتی ہے اسے کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے وہ پریس کو، ریڈیو کو، سینما کو، مدرسے کو، پوری انتظامی مشینری کو، اور پورے ملک کے معاشی کاروبار کو ایک خاص نقشے کے مطابق استعمال کرتی ہے۔ اس منصوبے کی کامیابی کا انحصار بھی اس پر ہے کہ تمام ملک میں سوچنے، رائے قائم کرنے اور فیصلہ کرنے والے دماغ صرف وہ چند لوگ ہوں جو مرکز میں بیٹھے منصوبہ بنا رہے ہیں۔ باقی سارا ملک صرف عملدرآمد کرنے والے دست و بازو پر مشتمل ہو جو بس اشارہ پاتے ہی چون و چرا تک نہ کریں۔ تنقید اور نکتہ چینی اور رائے زنی کرنے والوں کے لئے اس نظام میں جیل اور تختہ دار کے سوا کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور اگر ایسے دخل در معقولات دینے والے کو ملک بدر کر دیا جائے تو یہ گویا اس کے ساتھ بڑی رعایت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روس میں خود کمیونسٹ پارٹی کے بڑے بڑے سربرآوردہ کارکنوں اور لیڈروں تک کو جن کی محنتوں اور قابلیتوں ہی کی بدولت اشتراکی تجربہ کامیابی کی منزل تک پہنچا، موت اور حبس دوام اور جلاوطنی کی سزائیں دے ڈالی گئیں، صرف اس لئے کہ انہوں نے برسر اقتدار گروہ سے اختلاف کی جرأت کی تھی۔ پھر یہ اشتراکی اخلاقیات کا طرفہ تماشا ہے کہ جس کو بھی اختلاف کے جرم میں پکڑا گیا اس پر طرح طرح کے جھوٹے الزامات بے تحاشا لگا دیئے گئے۔ اور اشتراکی عدالتوں میں بھی یہ ایک حیرت انگیز کرامت پائی جاتی ہے کہ برسر اقتدار پارٹی جس کو بھی ان کے سامنے ملزم کے کٹہرے میں لا کھڑا کرتی ہے وہ استغاثہ کے عین منشا کے مطابق اپنے جرائم کی فہرست خود ہی فرفر سناتا چلا جاتا ہے اور کچھ دبی زبان سے نہیں بلکہ پورے زور و شور کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ وہ بہت بڑا غدار، سرمایہ داروں کا ایجنٹ اور روس کی آستین کا سانپ ہے!

پھر چونکہ یہ نظام انفرادی ملکیتوں اور مذہبی عقیدوں کو زبردستی کچل کر قائم کیا گیا ہے اور ابھی وہ سب لوگ دنیا سے اور خود روس کی سرزمین سے مٹ نہیں گئے ہیں جن کے جذبات و حسیات اور حقوق کی قبر پر یہ قصر تعمیر ہوا ہے، اس لئے کمیونسٹ پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ کو ہر وقت روس میں جوابی انقلاب کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ علاوہ بریں اشتراکی حضرات

یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ان کے انجن کے باوجود انسانی فطرت نام کی ایک چیز موجود ہے اور وہ انفرادی نفع طلبی کا جذبہ رکھتی ہے اور وہ ہر وقت زور لگا رہی ہے کہ پھر انفرادی ملکیت کا نظام واپس آجائے۔ انہی وجوہ سے ایک طرف کمیونسٹ پارٹی خود اپنے نظام کو آئے دن جلاب دیتی رہتی ہے۔ اگر جن لوگوں پر "رجعت" کی ذرا سی بو بھی پائی جائے انہیں "صاف" کیا جاتا ہے۔ اور دوسری طرف پارٹی کی حکومت سارے ملک میں جوابی انقلاب کے خطرات، امکانات، بلکہ شبہات اور وہم و گمان تک کو مٹا دینے کے لیے ہر وقت تلی رہتی ہے۔ اس نے جاسوسی کا ایک وسیع نظام قائم کر رکھا ہے جس کے بے شمار کارکن ہر ادارے، ہر گھر اور ہر مجمع میں "رجعت پسندوں" کو سونگھتے رہتے ہیں۔ اس جاسوسی کے پُراسرار جال نے شوہروں اور بیویوں تک کے درمیان شک شبہ کی دیوار حائل کر دی ہے۔ حتیٰ کہ ماں باپ کے خلاف خود ان کی اولاد تک سے جاسوسی کی خدمت لینے میں دریغ نہیں کیا گیا ہے۔ روس کی پولیس اور سی آئی ڈی کا محتاط "نظریہ" یہ ہے کہ اگر بھول چوک سے چند سو یا چند ہزار بے گناہ آدمی پکڑے اور مار ڈالے جائیں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ چند گنہگار چھوٹ جائیں اور ان کے ہاتھوں سے جوابی انقلاب برپا ہو جائے۔ اسی لیے وہ ہر فیکٹری، ہر کان، ہر دفتر اور ہر ادارے میں دیکھتے رہتے ہیں کہ کون منتظم یا کارکن ملک کے یا خود اپنے ادارے کے انتظام پر ناک بھوں چڑھاتا ہے یا کسی قسم کی بے اطمینانی کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح کا کوئی فعل کرنا تو درکنار جس پر شبہ ہو جائے کہ وہ ایسے جراثیم رکھتا ہے وہ بھی اچانک گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ آئے دن کا معمول ہے اس لیے جب کوئی کارکن اپنے وقت پر گھر نہیں پہنچتا تو اس کی بیوی خود ہی سمجھ جاتی ہے کہ پکڑا گیا۔ دوسرے دن وہ اس کی ضرورت کی چیزیں آپ ہی آپ پولیس کے دفتر میں پہنچانی شروع کر دیتی ہے اور ان کا قبول کر لیا جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کا قیاس صحیح تھا۔ لیکن کوئی سوال کرے تو دفتر کی طرف سے اسے کوئی جواب نہیں ملتا۔ ایک روز یکایک ایسا ہوتا ہے کہ اس کا بھیجا ہوا پارسل واپس آجاتا ہے۔ بس یہی اس امر کی اطلاع ہے کہ اس کا خاوند لینن کو پیارا ہوا۔ اب اگر وہ نیک بخت خود بھی اسی انجام سے دوچار ہونا نہ چاہتی ہو تو اس کا فرض ہے کہ ایک اچھی کامریڈنی کی طرح اس معاملے کی جانب سے منہ سی لے اور دوسرا کوئی ایسا خاوند ڈھونڈے جو "رجعت پسندی" کے شبہ سے بالاتر ہو۔

یہ ہے وہ قیمت جو دو وقت کی روٹی اور برے وقت کی دست گیری کے لیے اشتراکی روس کے باشندوں کو ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ کیا واقعی اس قیمت پر یہ سودا سستا ہے؟ بلاشبہ ایک فاقہ کش آدمی بسا اوقات بھوک کی شدت سے اتنا مغلوب ہو جاتا ہے کہ وہ جیل کی زندگی کو اپنی مصیبت بھری آزادی پر ترجیح دینے لگتا ہے، صرف اس لیے کہ وہاں کم از کم دو وقت کی روٹی، تن ڈھانکنے کو کپڑا، اور سر چھپانے کو جگہ تو نصیب ہوگی۔ مگر کیا اب پوری نوعِ انسانی کے لیے فی الواقع یہ مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ اسے روٹی اور آزادی دونوں ایک ساتھ نہیں مل سکتیں؟*

* کیا روٹی ملنے کی اب یہی ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ ساری روئے زمین ایک جیل خانہ ہو اور چند کامریڈ اس کے جیلر اور وارڈر ہوں؟